۸ اکتوبر کو ہماری زبان تسلیم ہیں آیا

R. N. 2186/57.

Regd. No A 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۲۲-۱۰-۶۱

جلد ۲۰ - شمارہ ۳۸ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر گیان چند

اُردو کے چند کوزی تجصوتیے

راقم الحروف نے یکم اگست اور ۱۵ر اگست سنہ ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اُردو میں ڈ، ڑ، ڈھ اور ڑھ تجصوتیے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹ ستمبر کے ہماری زبان میں اسلم صاحب نے اس پر رائے زنی کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ چودھری محمد نعیم کے مضمون اور ڈاکٹر مسعود حسین کے انگریزی رسالے کے ذکر میں میں نے کوئی تاریخی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی تھی۔ یوں اگر ایک دفعہ کو لغزش بھی ہو جاتی تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی کیونکہ مذکورہ رسالے میں تاریخ اشاعت یا تاریخ ترتیب کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ حذف کیا گیا ہے۔ رسالے کے شروع میں ایک پیش لفظ ہے وہ بھی تاریخ سے معرا ہے۔

تبصرہ نگار نے مضمون کے آخر میں ان چاروں آوازوں کو جداگانہ فونیم تسلیم کر لیا ہے لیکن پورے مضمون میں انھوں نے وکالت اسی کی کی ہے کہ ڈ اور ڑ کو ایک طرف تو ڈھ اور ڑھ کو دوسری طرف محض ہم صوت (Allophone) مانا جائے۔

موصوف کے مطابق صوت تجزیے کا بنیادی اصول کفایت ہے۔ میرے نزدیک صوت تجزیے کا بنیادی اصول آوازوں کا تضاد یا تکملی بٹوارے میں ہوتا ہے۔ کفایت پسندیدہ ہے لیکن بعض الفاظ یا اصوات سے چشم پوشی کر کے نہیں بلکہ ان کی کسی نئی تاویل سے حاصل کی جانا چاہئے مثلاً اردو کی دس ہکاری آوازوں کی بجائے محض ایک تجصوتیہ ہکاریت قرار دیا جائے یا غنائی مصمتوں [ن ڑ] کو [ن مخلوط ہ] کے مختلف روپ قرار دیا جائے۔ یا کفایت کی انتہائی مثال وہ کوشش ہے جسے Componential یا Feature Analysis کہتے ہیں جس کے مطابق پ ت ٹ ک کو بنیادی تجصوتیے مان کر ب۔ د۔ ڈ۔ گ کی بجائے ایک تجصوتیہ voice اور م۔ ن۔ ں گ۔ ڑ کی بجائے ایک تجصوتیہ غنائیت قرار دیا گیا۔ کفایت کی یہ مستی بے جا زبان کے ڈھانچے کو توڑ مروڑ رہی ہے۔ بہرحال کفایت بھی اسی قسم کی تاویلوں کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اگر وہ تضاد و تکمل کے اصول کو مجروح کر کے حاصل کی جائے تو محض بے اصولی ہے کفایت نہیں۔

فاضل مضمون نگار نے ڈ اور ڑ اور ڈھ اور ڑھ کی چند متضاد مثالوں کو مستثنیات قرار دے کر ان کو نظر انداز کرنا چاہا ہے بڑے ادب کے ساتھ گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ صوت تجزیے میں مستثنیات کی کوئی گنجائش نہیں۔ دو آوازیں آزاد تجصوتیے ہیں یا ہم صوت۔ اعراف کا کوئی خطہ نہیں۔ ع یہ زاہد مثلاً ادھر بھی ہے ادھر بھی، کی کیفیت ممکن نہیں۔ ہمیں دو ٹوک اور قطعی فیصلہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں چند بیانات مفید مطلب ہوں گے۔ افسوس ہے کہ یہاں پر لسانیات کی کتب موجود نہیں اس لئے خاطر خواہ اقتباسات پیش نہیں کئے جا سکتے۔ بہرحال تجصوتیوں کے بارے میں دو عبارتوں کی یاد دہانی کرا دینا چاہتا ہوں۔

(۱) ہاکٹ - کورس ان موڈرن لنگوسٹکس

Two allophones can not represent the same phoneme if they stand in contrast.

Complementary distribution: Neither occurs in any [illegible] in which the other is found. P 107

بلاک اور ٹریگر آوٹ لائن آف لنگوسٹک اینالیسس :-

Phonetically similar sounds which never contrast with each other to be classed together as allophones. P. 41

Compy Distn : None of them ever occurs in exactly the same position as any of others.

ڈینیل جونس اپنی کتاب The phoneme, its Nature and use (1949) میں تجصوتیے کے بارے میں رقم طراز ہے :-

No one member ever occurs in a word in the same phonetic context as any other. P. 10

ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک زبان کی دو آوازوں کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں مختلف تجصوتیے ہیں کہ نہیں تو اسے ایسے لفظوں کا ایک جوڑا تلاش کرنا چاہیئے جن میں محض ان دو آوازوں کی بنا پر فرق کیا جا سکے۔ لفظوں کے ایسے واحد جوڑے کی دریافت اس بات کا حتمی ثبوت ہے کہ یہ آوازیں مختلف تجصوتیے ہیں (ص ۳۹)۔ ان آوازوں کا اگر ایسا جوڑا نہ ملے تو مماثل ماحول کے دو الفاظ بھی ان کے تضاد کا کافی ثبوت ہیں (ص ۴۰)

اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ جونس رہبری کرتا ہے :-

One can not have a positive proof that 2 sounds must belong to one phoneme. They may however be presumed to be assignable to one phoneme if exhaustive tests fail to reveal any case of their occurence in similar phonetic contexts. As long as it is felt that there is a possibility of sounds occuring in the same phonetic context, they must be presumed to belong to separate phonemes. P. 41

مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ (۱) اگر دو بظاہر ہم صوت آوازیں محض ایک ایک لفظ میں بھی یکساں ماحول میں واقع ہوتی ہیں تو وہ تکمیلی بٹوارے میں نہیں، ان کو ہم صوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(۲) اگر دو آوازوں کا ایک بھی اقلی یا مماثل جوڑا مل جاتا ہے تو وہ تجصوتیے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو آوازیں ایک زبان کی بولی میں دو مختلف تجصوتیے ہوں اور اسی زبان کی دوسری بولی میں بجنسہٖ ہم صوت۔ فاضل تبصرہ نگار نے دلی کے آس پاس کی بولیوں کے استعمال کا ذکر کیا ہے۔ ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان سطور میں کس زبان اور کس بولی کے تجصوتیے زیر بحث ہیں۔ جدید کھڑی بولی کے اردو روپ کے۔

کھڑی بولی کا علاقہ مندرجہ ذیل اضلاع پر مشتمل ہے۔

دلی شہر۔ دہرہ دون کا میدانی علاقہ۔ سہارن پور مظفر نگر میرٹھ۔ ضلع بلند شہر کی تحصیل سکندر آباد۔ بجنور۔ مراد آباد رام پور۔ اور بعض کی رائے میں ضلع انبالہ کا مشرقی حصہ۔

میرا وطن ضلع بجنور ہے اس لئے اس علاقے کی بولی کے بارے میں کسی قدر وثوق کے ساتھ کہہ سکوں گا۔ برج۔ بندیلی اور اودھی کے علاقوں میں مصوتے کے بعد ڈ کو ڑ میں بول دیتے ہیں لیکن کھڑی بولی کے علاقے میں اس موقع پر ڈ ہی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اس علاقہ میں گڈریا۔ اڈانا۔ اُڈ وغیرہ کو ہمیشہ ڈ سے بولا جاتا ہے' ڑ سے نہیں۔ یہی معیاری اردو کا تلفظ ہے۔ آگرہ، الہ آباد، باندہ وغیرہ میں گڑریا اور اُڑ بولتے ہیں لیکن کھڑی بولی یا اردو کی حد تک یہ ٹکسال باہر تلفظ ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے اپنے انگریزی رسالے میں ص ۲۹ پر صحیح لکھا ہے کہ اردو لفظ کے آخر میں مشدد مصمتہ واقع نہیں ہوتا۔ کھڑی بولی کے علاقے میں اڈّ۔ گڈّ۔ کھڈّ کو مشدد الآخر کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے۔ مثلاً ہر شخص یہی کہتا ہے کہ موٹر کھڈّ میں گر پڑی، کھڈّ کوئی نہیں کہتا۔ فاضل تبصرہ نگار اپنے نوٹ میں یاد دلاتے ہیں کہ پراکرت میں یہ لفظ مشدد الآخر تھے۔ تجزیاتی یا توضیحی لسانیات کا یہ بھی اصول ہے کہ کسی موجودہ زبان یا بولی کا تجزیہ کرتے وقت اس کی گزشتہ تاریخ سراسر غیر متعلق ہے۔ آج کھڑی بولی میں جو الفاظ مستعمل ہیں ماضی بعید میں ان کی اصوات بیشتر مختلف تھیں۔ اگر قارئین میں سے کسی کو یہ گمان ہو کہ ڑ اور ڑھ بالترتیب ڈ اور ڈھ ہی کی جانشین ہیں تو یہ عرض کروں کہ ڑ کی سنسکرت[1] اصل द، [illegible] و [illegible] و [illegible] اور ڑھ کی اصل [illegible] و [illegible] و [illegible] و [illegible] میں سے کوئی آواز تھی۔ مختلف زبانوں میں آوازیں بھی بدلتی رہتی ہیں اور تجصوتیے بھی۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اردو الفاظ مشدد الآخر نہیں ہوتے۔ ہمیں اڈّا اور اُڑا کا ایک اقلی جوڑا مل جاتا ہے جو حتمی ثبوت اس کا ہے کہ ڈ اور ڑ آزاد تجصوتیے ہیں۔

دلی کے آس پاس کی بولیوں میں ڈ اور ڑ یا ڈھ اور ڑھ کا آزادانہ تغیر میں ہونا محض اسی وقت اہم ہو سکتا تھا اگر وہ سو فیصدی صورتوں میں رائج ہوتا۔ ایک بولی سے دوسری بولی میں یہ آوازیں متبادل ہو سکتی ہیں۔ لیکن معیاری کھڑی بولی میں ان کا متبادل ہونا شاذ ہے۔ (باقی صا پر)

[1] ڈاکٹر دھیرندر ورما۔ ہندی بھاشا کا اتہاس۔ ص ۱۸۱

اداریہ

سرسید کا پیغام

ہر سال علی گڑھ میں ۱۷؍ اکتوبر کو یوم سرسید منایا جاتا تھا۔ امسال چونکہ ۳؍ اکتوبر کے واقعات اور شہر میں گڑبڑ کی وجہ سے یونی ورسٹی بند ہو گئی ہے اس لئے یہ دن نومبر میں منایا جائے گا، مگر سرسید کے پیغام کو یاد رکھنے کی جتنی ضرورت اس وقت ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔

سرسید نے ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً یہ تعلیم دی کہ وہ مغرب کی ہر چیز سے بھڑکیں نہیں بلکہ اس کی سائنس، تہذیب، علم اور فکر کو جذب کریں۔ انھوں نے ہر مسئلے میں عقل کو رہنما بنایا اور انسانی تجربے اور علم کی مدد سے ہر وقت کام لینے پر زور دیا۔ انھوں نے دین کے ساتھ دنیا پر بھی توجہ دی۔ انھوں نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو مشرق اور مغرب کی بہترین روایات کا آئینہ دار تھا۔ انھوں نے خلوص اور لگن سے کام کرنے والے جمع کئے۔ انھوں نے اپنی زبان کو اس قابل بنایا کہ وہ سادہ اور عام فہم اسلوب میں بڑے سے بڑے مسائل کو بیان کر سکے۔ انھوں نے شاعری میں سادگی، واقعیت اور خلوص پر زور دیا۔ انھوں نے نثر میں واضح خیالات کے واضح اظہار کی ضرورت ظاہر کی۔ اُنھوں نے خواب دیکھے اور خوابوں کو حقیقت بنانے میں لگے رہے۔ اُنھوں نے مصنفوں اور قومی کارکنوں کی ہمت افزائی کی۔ اُنھوں نے فرسودہ روایات کو ترک کرنے کی ہدایت کی اور نیچر یا انسانی فطرت کو ہر وقت سامنے رکھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے پرجوش حامی تھے، لیکن چونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان بہت مایوس اور بددل ہو گئے تھے اور حکومت بھی ان سے بدظن تھی اس لئے اس پر زور دیا کہ وہ سب سے پہلے اپنی تعلیمی پستی کو دور کریں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، اس کے بعد سیاسی حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ آج بھی ہم میں حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کم ہے، ہم دقیانوسی تصورات کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ سرسید ہمیں سکھاتے ہیں کہ علمی دنیا میں اپنا مقام پیدا کریں، جدید افکار کو اپنائیں، عقلیت کو رہنما بنائیں، سنی سنائی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے تجربات کو پرکھیں۔ سرسید آج زندہ ہوتے تو وہ ہندوستانی قومیت کے پرجوش مبلغ اور حامی ہوتے۔ قومی نقطۂ نظر سے ہی ہم حالات کا صحیح جائزہ لے سکتے ہیں۔ مشترک تہذیب کے علمبردار بن کر ہی ہم ہندوستانی تہذیب کی وحدت اور اس وحدت کے رنگا رنگ پہلوؤں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ آج سرسید کا نام لینا کافی نہیں، ان کے افکار کی روح کو سمجھنا، ان کے حقیقی پیغام کو پہچاننا اور انھوں نے اپنے دور کو سامنے رکھ کر جو باتیں کہی تھیں ان کو نظر انداز کرنا، ضروری ہو گیا ہے۔ ہر نسل کو اپنے ماضی کا اسی طرح سوجھ بوجھ کے ساتھ جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم موجودہ نسل میں یہ سوجھ بوجھ پیدا کریں، تاکہ جدید ہندوستان کے نقشے میں ہمارا رنگ بھی ہو اور ہمارے رنگ سے پوری قوم کے نقشے کا حسن بھی قائم رہے۔

پڑھنے والوں سے معذرت

"۳؍ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو شہر میں اچانک گڑبڑ ہونے، کرفیو لگنے، پریس بند ہونے اور عام کاروبار معطل ہونے کی وجہ سے نہ تو یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کا شمارہ وقت پر ڈاک خانہ ہی جا سکا اور نہ ۸؍ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کا شمارہ شائع کیا جا سکا، جس کے لئے ہم "ہماری زبان" کے پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہیں۔" (ادارہ)

اِدھر اُدھر سے

سہ ماہی "مجلس" کا مومن نمبر

اُردو مجلس حیدرآباد، کے سہ ماہی ترجمان "مجلس" کے "مومن نمبر" کی طباعت کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ خاص نمبر خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ میں طبع ہو رہا ہے۔ اس کی ضخامت تین سو صفحات کی ہوگی۔ "مجلس" کا یہ شمارہ اُردو کے منفرد غزل گو شاعر مومن کی حیات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اردو دنیا کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور تنقید نگاروں کے ۲۲ گراں قدر، معلومات افزا اور فکر انگیز مضامین پر مشتمل ہوگا۔

سید احتشام حسین کا تقرر بحیثیت پروفیسر

یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور ادیب و نقاد سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا تقرر الٰہ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت اردو پروفیسر ہو گیا ہے۔

منظر صدیقی کے معالجے کیلئے حکومت پاکستان کی پیشکش

اُردو کے پرانے صحافی اور مشہور شاعر منظر صدیقی اکبرآبادی کے علاج کے لئے حکومت پاکستان نے رائٹرز گلڈ کے توسط سے سو روپیہ ماہانہ مقرر کیا ہے۔ موصوف دو سال سے

مرض دق میں مبتلا ہیں۔ حکومت نے انھیں کسی اچھے سینی ٹوریم میں داخلے کی بھی پیش کش کی ہے۔

دولت مشترکہ کی پریس یونین کا اجتماع

ماہ رواں میں پہلے کراچی میں اور بعد میں دہلی میں دولت مشترکہ کی پریس یونین کا ایک اجتماع ہوگا جس میں دنیا بھر کے بڑے بڑے اخباروں کے ساتھ ایڈیٹر شرکت کریں گے۔ یہ جماعت دنیا بھر میں ایک بہت بڑا صحافتی ادارہ ہے جس کی داغ بیل ۶۰ سال پہلے ڈالی گئی تھی۔ اس کا مقصد دولت مشترکہ کے اخباروں اور رسالوں کو فروغ دینا ہے۔ اس تنظیم کے پہلے صدر لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے بانی لارڈ برنہام تھے۔ اس کے ممبر دولت مشترکہ کے ممالک کے اخباروں اور رسالوں کے مالک ہو سکتے ہیں یا خبر رساں ایجنسیوں کے مالک۔ یہ ارکان کامن ویلتھ پریس یونین کو اپنی حیثیت کے مطابق مالی امداد دیتے ہیں۔ اس کے ستر ارکان ہیں تیس برطانیہ کے ہیں اور چالیس دولت مشترکہ کے دوسرے ممالک کے۔ یہ جماعت پریس کی آزادی پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ صرف اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی قائم ہے جو اخباروں کے اس حق کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور دیکھتی ہے کہ اخباروں کی آزادی میں مداخلت تو نہیں کی گئی۔ چاہے یہ عام اخبار کے خلاف یا دولت مشترکہ کے کسی دور افتادہ حصے میں کام کرنے والے کسی ایک نامہ نگار کے خلاف۔ ایسے حالات میں یہ یونین اس حکومت کے خلاف کارروائی کرتی ہے جس نے پریس کی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس یونین کی طرف سے اخبار نویسوں کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اور وہ دولت مشترکہ کے دوسرے ممالک میں جا کر اس فن کی ٹریننگ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس یونین کی خود مختار شاخیں دولت مشترکہ کے تمام ممالک میں موجود ہیں۔

مجاہدین جنگ آزادی کی تاریخ

حکومت مدھیہ پردیش نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ملک کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہدین کے حالات زندگی اور کارہائے نمایاں کی تاریخ شائع کرے گی۔ اس اسکیم پر ۲۴ ہزار کے مصارف آئیں گے۔

ثقافتی لٹریچر کی تیاری کے بارے میں تیسرا مقابلہ

مرکزی وزارت تعلیم کے زیر انتظام بنیادی اور ثقافتی لٹریچر کی تیاری کے تیسرے مقابلہ کے لئے امیدواروں کو اپنے داخلے ۱۵ ستمبر ۶۱ء تک بھیجنے تھے لیکن اب داخلے وصول کرنے کی آخری تاریخ میں ۳۱ اکتوبر ۶۱ء تک توسیع کر دی گئی ہے۔ یہ اس غرض سے کی جا رہی ہے کہ نظر ثانی کردہ ضوابط کے تحت امیدواروں کو اپنے داخلے (کتابیں یا مسودے) کی چار کاپیاں پیش کرنے کی مہلت مل جائے۔

اس اسکیم کے تحت نوخواندہ اشخاص اور اجتماعی ترقی کے بلاکوں کے علاقوں میں کام کرنے والوں کے لئے کتابیں اور مسودے تیار کئے جاتے ہیں۔

موہان میں حسرت کی یادگار

موہان (ضلع اناؤ) کے سربرآوردہ شہریوں کے ایک جلسہ میں جو زیر صدارت سید احمد صاحب رضوی ہوا طے پایا کہ ایک سوسائٹی مولانا حسرت مرحوم کی یادگار میں قائم کی جائے جس کا نام "حسرت میموریل سوسائٹی" رکھا جائے۔ کمیٹی کے لئے حسب ذیل عہدیدار چنے گئے۔

سرپرست:۔ ایچ۔ بی۔ سنہا صاحب پرنسپل موہان کالج و ڈاکٹر اظہار الحسن صاحب و ڈاکٹر مہدی حسن صاحب و بھگوتی پرشاد صاحب شتاب اور مولوی سید نشاط حسین صاحب، صدر، سید احمد صاحب رضوی نائب صدر، سید فیاض حسین صاحب سکریٹری، سید شوکت اختر صاحب جوائنٹ سکریٹری، سید مظفر حسین صاحب کنوینر، سید وہاج الدین صاحب خازن، ہدایت رسول صاحب مشیر، جناب محمد علی صاحب رضوی۔ پروپیگنڈہ سکریٹری، ڈاکٹر سید شمشاد حسین صاحب۔

سنسکرت کی کتابوں پر انعامات

حکومت ہند نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طلبہ میں سنسکرت کی کتاب مفت تقسیم کرنے اور اس کتاب کے مصنف کو انعام دینے کے لئے پروفیسر بی۔ این۔ ویرکر اور شری پی۔ سی۔ جوشی کی کتاب "سنسکرت وِہار" کو منتخب کیا ہے۔ اس کتاب کے مصنفوں کو اول انعام دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کے۔ ایل۔ وی۔ شاستری کی کتاب "بھوجا ماولی" کو دوسرا انعام اور گجانن شاستری کی کتاب "سنسکرت سوادھیائے" کو تیسرا انعام دیا جائے گا۔

ایشیائی تاریخ سے متعلق نئی دہلی میں پانچ روزہ سمینار

نئی دہلی میں [illegible] نومبر سے [illegible] دسمبر سے ایشیائی تاریخ کے سلسلے میں ایک پنج روزہ سمینار کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستانی اور ایشیائی عالم اور مورخ شریک ہوں گے۔

انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز، انڈین ہسٹری کانگریس اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کی طرف سے یہ سمینار بلائی گئی ہے۔ ایشیا کی سرزمین پر یہ اپنی قسم کی پہلی ایشیائی کانگریس ہے۔

ایشیائی تاریخ کے سلسلے میں پہلے بھی متعدد بار عالمی اجتماع ہوئے ہیں لیکن اس قسم کی تمام کانفرنسیں یورپی علاقوں میں ہوئی ہیں۔ ایشیا اور ہندوستانی مورخوں کو پہلی بار موقع ملے گا کہ وہ اپنے براعظم کی تاریخ کی طرف توجہ دے سکیں۔

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو کانفرنس

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے دسمبر کے پہلے ہفتے میں ایک سہ روزہ کانفرنس حیدرآباد میں منعقد کی جائے گی جس میں ریاست کے اردو کے مسائل کا جائزہ لیا جائے گا۔ آندھرا پردیش میں اقتدار کو غیر مرکوز کرنے کی اسکیم کے نفاذ اور لازمی ابتدائی تعلیم کے پروگرام کی وجہ سے اردو کے جو مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان کا جائزہ لینے کے لئے اضلاع اور تعلقہ جات سے زیادہ سے زیادہ مندوبین کو مدعو کیا جائے گا۔

غزل

اختر انصاری

چھل گیا زخم آج سینے کا
لطف آیا مجھ کو اب تو جینے کا

خون دل کی طرح جو پیتا ہے
حق پہنچتا ہے اس کو پینے کا

رند ہوتے ہیں باصفا لاریب
بادہ دشمن ہے دل کے کینے کا

کون جانے محیط ظلمت میں
ناخدا کون ہے سفینے کا

عمر بھر موت کا مزہ چکھا
خاک دیں گے حساب جینے کا

کس کی گردن پہ ہے بتاؤ کوئی
خون بہتے ہوئے پسینے کا

دل کے ویرانے جگمگاتے ہیں
کون وارث ہے اس دفینے کا

بے قرینہ ہے طالع اختر
آدمی ہے بہت قرینے کا

غزل

منظر ایوبی

یہ شمس و قمر یہ لالہ و گل یہ بادہ یہ انجم کچھ بھی نہیں
ہیں کانٹوں پہ ایماں لایا ہوں پھولوں کا تبسم کچھ بھی نہیں

اب آپ کے لطف پیہم سے اظہار تصنع ہوتا ہے
میں جذب دروں کا قائل ہوں انداز تکلم کچھ بھی نہیں

خاموش لبوں پر بھی اکثر افسانے بکھرے ہوتے ہیں
اظہار وفا کرنے کے لئے مخصوص تکلم کچھ بھی نہیں

اے پیر مغاں اب بدلے گی تنظیم ترے میخانے کی
یہ جام بہت بوسیدہ ہیں یہ ٹوٹے ہوئے خم کچھ بھی نہیں

جو اپنی زمیں کے جلووں سے مدہوش تجلی ہو جائیں
ان اہل نظر کی آنکھوں میں حسن مہ و انجم کچھ بھی نہیں

بیتابی دل کو منظر نے دنیا سے چھپایا ہے لیکن
اک کوشش ضبط غم کے سوا ہونٹوں کا تبسم کچھ بھی نہیں

غزل

شمس فریدی

وہ زندگی جو بہت خوشگوار گذری ہے
خدا گواہ کہ دنیا پہ بار گذری ہے

گلوں میں بوئے وفا ڈھونڈتی ہوئی اکثر
چمن سے باد صبا بے قرار گذری ہے

گلوں کے ساتھ ہی کانٹے بھی مسکرائے ہیں
کچھ اس طرح بھی چمن سے بہار گذری ہے

سمجھ نہ پاؤ گے تم میرے غم کا افسانہ
تمہاری شام و سحر خوشگوار گذری ہے

وہ رات کتنے ستارے جو جگمگا نہ سکی
وہ رات شمس بہت مجھ پہ بار گذری ہے

غزل

انور معظم

قفس لب کون اٹھا، تم، ترے سمجھانے سے
سوچتا ہوں کہ پیوں کون سے پیمانے سے

خیر اتنا تو ہوا زلف بکھر جانے سے
کوئی وحشی پلٹ آیا کسی ویرانے سے

زندگی آج بہت پاس سے ہو کر گزری
آج راحت سی ہوئی ہے ترے یاد آنے سے

کتنے چاند اپنی ہی راتوں سے بچھڑ جاتے ہیں
اک تری زلف کے عارض پہ بکھر جانے سے

آزمائے ہمیں تنہائی پہ اتنا تو نہیں
چاند سورج بھی نظر آتے ہیں بیگانے سے

غزل

سید حرمت الاکرام

غم ہائے رنگ رنگ کی شدت میں گزری ہے
یہ عمر زندگی کی عبادت میں گزری ہے

کانٹوں کی ہم نشینی نہیں سہل اس قدر
پھولوں کی زندگی بھی اذیت میں گزری ہے

فکر و نظر کے رنگ تنوع کے باوجود
دل کی حیات ایک ہی صورت میں گزری ہے

کیا تھی وہ زندگی، یہ کیسے ہم بتانے جائیں
وہ زندگی کہ جینے کی حسرت میں گزری ہے

لذت کش حیات رہا دل ہر آئینہ
گزری ہے اور درد محبت میں گزری ہے

احساس بے کسی کی نہ تکمیل ہو سکی
وہ دن بھی اعتماد رفاقت میں گزری ہے

وہ عمر گزری ہے جو رفاقت میں عقل کی
اک طرح وہ بھی دل کی اطاعت میں گزری ہے

اس زندگی کا دل پہ کچھ احسان کم نہیں
وہ زندگی جو تیری محبت میں گزری ہے

اس دل کو ڈھونڈتا ہوں کہ جس دل کی ایک عمر
حسن تصورات کی خلوت میں گزری ہے

زحمت حیات ہم نے گزاری ہے اس طرح
رسوائیاں بھی کبھی شہرت میں گزری ہے

غزل

مجتبیٰ آفاق

کوئی بتاؤ کہ ہے کون چاندنی کا وطن
ملے جہاں سے ہمیں مستعار کوئی کرن

شعور راہ نہیں پھر بھی منزلوں کی لگن
اور اس کے ساتھ ستم یہ کہ قلب راہزن

بہار ہم کو بھی دست یاس کے نام ہے
کھلے تھے پھول تو زاروں نے بھرے دامن

خدا را آپ ہی دل پھیر کر مسکرا دیجے
کہیں سے پھوٹ پڑے زندگی کی کوئی کرن

معاصرین

اُردو والوں کے لئے ایک خوشخبری

عدالتی ضابطہ میں نئی ترمیم

(از جناب آفتاب احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ بنارس)

کچھ عرصہ قبل یہ محسوس کیا گیا کہ عدالت العالیہ الٰہ آباد کے جنرل رولس (سیول) میں اُردو کے استعمال کے بارے میں واضح ذکر نہ ہونے کے باعث صوبہ کی تمام ماتحت عدالتوں میں اُردو میں عرضی دعویٰ، جوابدہی اور درخواستوں وغیرہ کے داخل کرنے میں کافی دقتیں پیش آرہی تھیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں حکومت کے اعلانات اپنی جگہ پر موجود تھے لیکن پھر بھی قانونی پوزیشن کی قطعی وضاحت کے لئے جنرل رولس (سیول) میں مناسب ترمیم کرنا بہت ضروری تھا لہٰذا میں نے اپنے خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۵۹ء کے ذریعہ جناب جج انتظامیہ ہائی کورٹ الٰہ آباد کی توجہ اس معاملہ کی طرف مبذول کرائی۔ عدالت العالیہ کے رجسٹرار نے اپنے خط مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۹ء کے ذریعہ مطلع فرمایا کہ معاملہ کورٹ کے زیر غور ہے۔ تقریباً ایک سال انتظار کرنے کے بعد دوبارہ اپنے خط مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۰ء کے ذریعہ میں نے متذکرہ معاملہ کا جلد تصفیہ کئے جانے کے بارے میں جناب جج انتظامیہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔ اس کے جواب میں عدالت العالیہ کے خط مورخہ ۸ جون ۱۹۶۰ء کے ذریعہ مجھے آگاہ کیا گیا کہ معاملہ ریاستی حکومت کے زیر غور ہے۔ اطمینان اور مسرت کی بات ہے کہ آنریبل ہائی کورٹ نے جنرل رولس (سیول) میں ضروری ترمیم کر دی ہے اور باب ۳ رول ۱۴ کی عبارت میں لفظ ہندی کے بعد لفظ اُردو بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ اس طرح صوبہ کی تمام ماتحت دیوانی عدالتوں کے لئے اب لازمی ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں، عرضی دعویٰ اور جوابدہی کسی عدالت میں داخل کرے تو اسے قبول کیا جائے گا۔ جنرل رولس (سیول) میں متذکرہ ترمیم عدالت العالیہ الٰہ آباد کے انتظامیہ ڈپارٹمنٹ کے نوٹیفکیشن نمبر No. 30/VIII مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۱ء کے ذریعہ کی گئی ہے۔ تمام اردو داں حضرات اس سہولت سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب بھی اگر کہیں دقت پیش آجاتی ہے تو متعلقہ ڈسٹرکٹ جج یا ہائی کورٹ کے ذمہ داران کے علم میں یہ بات فوراً لائی جانی چاہئے۔ (صدق جدید)

اُردو کتابوں کی نایابی

مکرمی۔ اسکول جولائی میں کھلے تھے اور اب ستمبر ختم ہو رہا ہے۔ مگر اب بھی پرائمری اسکول کی اُردو کتابیں شہر بارہ بنکی میں نہیں ملتی ہیں۔ جن لڑکوں نے اردو پڑھنا چاہا ہے وہ کس طرح سے پڑھیں، دوکانداروں سے اردو کتابوں کیلئے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کہاں سے لائیں جبکہ وہ کتابیں ہی نہیں ملتیں۔ ایسی حالت میں اردو مضمون شامل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ (ایم۔ اے۔ حامدی)

اُردو کی دشواریاں

مکرمی۔ آپ کے اخبار قومی آواز میں یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ لسانی کمیٹی اتر پردیش نے اردو سے متعلق شکایات کے سلسلے میں جو سوالنامہ جاری کیا تھا اس کے جوابات بھیجنے کی تاریخ میں ۱۵ اکتوبر ۶۱ء تک توسیع کر دی گئی ہے۔ اردو کے ساتھ حکومت کا یہ رویہ شکریہ اور مبارکباد کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ سوالنامہ کے مفصل جوابات کمیٹی کو بھیج دئے جائیں گے۔ مگر اس سلسلے میں چند باتیں کمیٹی کے لئے زیادہ غور طلب ہیں جن کا تعلق خود سرکار سے ہے۔

بہت سے ایسے محکمے ہیں جن کا تعلق ہر خاص و عام سے رہتا ہے جیسے روڈویز اب ٹکٹ خریدنے والا اگر ہندی نہیں جانتا ہے تو اسے پتہ نہیں کہ اس کو کانپور کے بجائے کسی اور جگہ کا تو ٹکٹ نہیں مل گیا ہے۔ بس اسٹیشنوں کے نام اردو میں نہیں ہیں اردو داں مسافر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح عدالتوں اور کچہریوں کے سائن بورڈ اُردو سے خالی ہیں۔ بے چارے اہل معاملہ اِدھر اُدھر منزل کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نیز گنے کی پرچیاں۔ پنچایت ٹیکس اور لگان کی رسیدیں سب کو ہندی میں ملتی ہیں۔

اُردو کے مدارس اور مکاتب اسلامیہ کو سر رشتہ سے جو ہدایت نامے بھیجے جاتے ہیں وہ تقریباً ہندی میں ہوتے ہیں۔ نیز ان کے یہاں کے سالانہ بھی ہندی میں لکھے جاتے ہیں۔ جو نئی لائبریریاں کھولی جاتی ہیں ان میں اُردو کتابیں یا تو منگائی نہیں جاتی ہیں، یا برائے نام۔ جیسے ہمارے صورت گنج کی بی۔ ڈی لائبریری میں قسم کھانے کو کوئی اُردو کتاب نہیں ہے۔ صرف ایک اُردو اخبار آتا تھا مگر اب وہ بند ہو گیا ہے۔

بعض کتابیں اب تک بازار میں نہیں آئی ہیں۔ امروز فردا کی امید پر تعلیم کے تین مہینے گزر چکے ہیں۔

مدارس میں سیکڑوں بچوں میں دس بچے اُردو پڑھنے والے کیا واقعتاً تیار نہیں ہوتے یا کسی شرارت کی وجہ سے وہ اردو نہیں لے پاتے۔ مثال کے طور پر سونڈ صیا مئو، حضرت پور اور بلوئی۔ ضلع بارہ بنکی اور نورپور محمود آباد ضلع سیتاپور کے حالات غور طلب ہیں۔

اُردو کے متعلق سوالنامہ کے جوابات اگر کم تعداد میں موصول ہوئے ہیں تو کیوں؟ اُردو والے مایوس تو نہیں ہیں اور اردو والوں میں جو مایوسی، احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اس کا تدارک کیسے ہوگا۔ بہت سے اسلامی مکاتب توڑ دئے گئے ہیں جن میں اپر پرائمری درجات تک اُردو تعلیم ہوتی تھی۔ مناسب ہوگا کہ اس بات کی جانچ بھی خفیہ طور پر کرائی جائے کہ سرکار نے اُردو کے متعلق جو احکامات اپنے افسروں کو دئے ہیں ان کی تعمیل کیوں نہیں ہوتی۔

(شمس الدین نوری قاسمی۔ صورت گنج ضلع بارہ بنکی)

(قومی آواز)

انجمن کا خبرنامہ

کیپٹن وی۔آر۔ موہن کا خطبۂ استقبالیہ

آل انڈیا جگر کمیٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ میں ۱۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر لکھنؤ کے ڈپٹی میئر کیپٹن وی۔آر۔ موہن نے جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا وہ درج ذیل ہے:-

محترم صدر! بھائیوں اور بہنوں!

آپ کو علم ہے کہ آج اس جگہ ہم شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اس محفل میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ صحافی بھی اور نقاد بھی۔ ادب دوست بھی اور ادب نواز بھی۔ جگر مرحوم کے احباب بھی، ان کے معتقد اور پرستار بھی۔ ایسے اجتماع کی مجلس استقبالیہ کا صدر بنا کر آپ نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے اس کا میں تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔

جب ہم کسی عظیم ہستی سے منسوب کوئی دن منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں تو ہمارے سامنے اس شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور ان میں سے بعض پر کسی کو اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے۔ قطع نظر ان اختلافات کے جو حضرت جگر کے متعلق بھی ادبی ناقدین کے حلقوں میں سنے جاتے ہیں۔ ہمارے سب کے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم ان کی شاعری اور فکری ہم آہنگی کے اس رجحان کو سامنے رکھیں جس نے ادبی دنیا کے وسیع حلقے کو ان کا دلدادہ بنا دیا۔

جگر مرحوم کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالیئے تو آپ کو اس میں سہ پہلو بہت نمایاں نظر آئیں گے۔ ایک پہلو ہے کشمکشِ حسن و عشق کا، دوسرا پہلو ہے شراب کا زور، تیسرا پہلو عبدیت کے اقرار اور انسانی اقدار کی بقا کا۔ میرا خیال ہے اس تیسرے پہلو نے تمام دوسرے رجحان اپنے اندر اس طرح سمو لئے کہ ان کی شاعری نے وحدتِ خیال اور ندرتِ فکر کے ہاتھوں دل کی جمالیاتی حس کو جھنجوڑا۔ نگاہِ حسن پرست کو روشنی بخشی۔ شعور کو بیدار اور دماغ کو روشن کر کے طبیعت میں کیف و گداز کا وہ عالم پیدا کر دیا جو شعر کے قالب میں ڈھل کر ذہنی عظمتوں کا خود اعتراف کرا بیٹھا۔ یہ اعتراف کوئی معمولی اعتراف نہ تھا اس میں جگر کی مقامِ عشق سے واقفیت، اعتدال پسند رویّہ اور انسان دوست فطرت کا قدم قدم پر بر کاب ہونا بھی شامل ہے اور جس کی جانب خود حضرت جگر کا یہ شعر بار بار اشارہ کرتا ہے:-

کارگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

وطن پرست اور وطن سے بے انتہا محبت جگر کی فطرتِ ثانیہ تھی وہ ایسے پُر آشوب ماحول میں بھی جو تقسیمِ وطن کی پیداوار تھا اپنے جادہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی قیمت پر بھی اپنے وطنِ عزیز کے سنگھی ساتھیوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ انکی زندگی کا آغاز عینک کے کاروبار سے ہوا اور وہ اپنی زندگی کے خود معمار بنے۔ انھوں نے کبھی ناسازگار حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ جب بھی کوئی ایسا مقام آیا اس وقت یہ پھر کر نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا کیا۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن • لیکن اپنا اپنا دامن

جگر خوب پیتے تھے اور جی بھر کے پیتے تھے لیکن انکے اس قوتِ ارادی کی مثال بھی ملنا مشکل ہے کہ انھوں نے جس دن سے جام و مینا سے کنارہ کشی کی پھر اس کے حسنِ تبسم پر تو نگاہ رکھی لیکن لبوں تک جام کو آنے نہ دیا۔

حضرت جگر کا پیغام محبت تھا اور محبت بھی اخلاقی اصولوں، انسانی رشتوں کو جوڑنے والی۔ ان کے نزدیک اونچ نیچ۔ امیری و غریبی سب ہی ایک صف اور درجہ میں نظر آتے ہیں۔ وہ نہ تو سیاسی شاعر تھے اور نہ اس کی طرف مائل ہی۔ خود ہی کہتے ہیں:

ان کا جو فرض ہے ارباب سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر صاحب کا قول تھا "اخلاق کی قدر کرنا چاہیے میں تو اس ڈاکو کی بھی قدر کرتا ہوں جو اپنے پیشہ میں مخلص ہو" جگر کی اس خلوص پسند طبیعت کی پوری عکاسی خود ان کے اس شعر سے ہو جاتی ہے:

جگر کی ہے زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے ایماں ہے سب کی عزت، جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

آج بھی ان کے سیکڑوں شعر زبان زدِ عوام ہیں اور شاید انھیں سب سے زیادہ مقبول عہدِ شباب کا شعر یہ ہے:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اور پھر آخری غزل کا یہ شعر:-

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

میرا خیال ہے کہ جگر نہ صرف ہندوپاکستان کے ممتاز شعراء میں تھے بلکہ وہ آسانی سے ورڈس ورتھ، شیلے اور کیٹس کی صف میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اسی ممتاز حیثیت نے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے صاحب فہم و ذکا ادب دوست شخصیت کو انکی یادگار سوسائٹی کے قیام پر مجبور کیا اور ڈاکٹر بی راما کرشن راؤ کو اس محفل کے انعقاد کا جذبہ پیدا کر دیا اور یہ بات لکھنؤ کے لئے قابل فخر ہے کہ اس عظیم شاعر کی یادگار میں سب سے پہلا میموریل مشاعرہ منعقد کرنے کی ذمہ داری ادارۂ فروغ اردو کے ذمہ داروں نے لی۔ یہ ادارہ جس انداز میں ادبی خدمات انجام دے رہا ہے وہ قابل صد ستائش ہے۔ مبارکباد کے قابل ہیں جناب پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، اقبال صدیقی اور محمد حسین شمس، وصی احمد جن کا ہر وقت اس ادارہ کو تعاون حاصل رہا ہے۔

میں اس موقع پر اشارۃً مشورہ کے طور پر اپنے دل کی بات بھی زبان پر لانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آج اس ملک میں اردو کو ایک مخصوص فرقہ کی زبان ذہن نشین کرایا جا رہا ہے، یہ علامت ایک سخت ترین بیماری کی حیثیت رکھتی ہے اس کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ اردو کے پبلشرز انجمنیں ہندی اور دوسرے ادب کے بہترین اثاثے کو بھی اردو میں منتقل کریں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ اردو کی عظیم تخلیقات کو رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہندی میں تبدیل کئے جانے کا کام بھی تیزی سے ہوتا۔ یہ کام کچھ ادارے کر بھی رہے ہیں لیکن اگر اردو کے ناشرین اپنے پروگراموں میں اسے بھی شامل کر لیں تو میرے خیال میں وہ لسانی ہم آہنگی کے لئے فضا کو بہت کچھ ہموار کر سکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ حضرات اس مشورہ پر بھی سنجیدگی سے غور کریں گے۔ اس سلسلہ میں بھی آپ کو جگر مرحوم کی شخصیت ایک Symbol یا علامت نظر آئے گی جو انھیں اپنے دور کا عبقری شاعر تسلیم کراتی ہے۔ اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے ممتاز روزناموں، ہفتہ وار اخباروں اور دیگر جریدوں نے جگر مرحوم پر جو مضامین شائع کئے ہیں وہ انکی ہر دلعزیزی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ خصوصیت سے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے جگر کی شخصیت اور ان کے کردار و شاعری پر جو اپنے ماہنامہ کے دو ضخیم نمبر شائع کئے وہ قابل فخر ہیں۔ اس سلسلہ میں اسی شہر کے اخبارات میں نیشنل ہیرالڈ، پائنیر، نوجیون، سوتنتر بھارت، قومی آواز قابل ذکر ہیں۔ اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ جگر کے چاہنے والوں میں ہندی اور اردو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ اس علامت کو نمایاں کرنے میں اردو دوست جو کام کر سکتے ہیں انھیں اس سے کسی وقت بھی نہیں چوکنا چاہئے۔

آخر میں آپ سب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے فروغ اردو جگر میموریل سوسائٹی کی جانب سے آپ سب کا استقبال کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ آپ ملک کی سالمیت اور قومی ہم آہنگی کو ادب کے ذریعہ تقویت پہنچانے کی جدوجہد کریں گے۔

جناب گوپال ریڈی مرکزی وزیر ورکس ہاؤسنگ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مشاعرہ کا افتتاح فرمایا۔

جے چند

اردو لائبریری، گیا کی تنظیم نو

اردو لائبریری، گیا کی تنظیم نو کے سلسلے میں ممبران لائبریری کا ایک اہم جلسہ زیر صدارت جناب سید قمر الہدیٰ حمید منعقد ہوا تھا، جس میں طے پایا کہ اردو لائبریری کے ذریعہ عوام میں تہذیبی اور ادبی سرگرمی پیدا کرنے کے لئے اور لائبریری کو استحکام دینے کیلئے ممبرسازی کی مہم چلائی جائے اور اردو لائبریری، گیا میں زندگی لانے کے لئے ایک سالانہ جلسہ کیا جائے جس میں ادبی انعامی مقابلے، مباحثہ اور مشاعرہ کی تجویزیں کثرت آرا سے منظور ہوئیں اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اردو لائبریری کی اپنی ایک مستقل عمارت بھی قائم کی جائے۔ اس کے لئے سکریٹری اردو لائبریری کو اختیار دیا گیا کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھائیں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ دوسری نشست میں ممبران لائبریری کی حوصلہ افزا تعداد موجود تھی جس نے پچھلے ہفتہ کی کارروائی سنی اور مندرجہ ذیل تجاویز طے پائیں۔

۱۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے انتقال پر تعزیتی تجویز منظور کی گئی۔

۲۔ لائبریری کے قیام کو چونکہ پچیس سال ہو چکے ہیں اس لئے طے پایا کہ آئندہ سالانہ جلسہ سلور جوبلی کے نام سے منایا جائے۔

۳۔ انعامی مقابلے کے سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جسے اختیار دیا گیا کہ وہ آئندہ ہفتہ کی میٹنگ میں ایک تفصیلی خاکہ پیش کرے۔

۴۔ طے پایا کہ ایک اردو لائبریری رننگ ٹرافی جاری کیا جائے جو مباحثہ میں اول آنے والی ٹیم کو دیا جائے گا اور ممبران سے اپیل کی گئی کہ وہ شہر کے کسی باذوق اور صاحب دل کو ٹرافی کے عطیہ کے لئے رجوع کریں۔

۵۔ آخر میں بالاتفاق رائے ممبران سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے طور پر عوام میں اردو لائبریری کا چرچا کریں اور ان سے لائبریری کے لئے ہر ممکن تعاون حاصل کریں۔

(سکریٹری)

تحسین سروری

غالب کا ایک خط

حبیب اللہ ذکاؔ کے نام

کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے شعبۂ نفائس میں مرزا غالب کا ایک اصل خط موجود ہے جس کو کافی احتیاط سے میں نے نقل کر لیا ہے۔ یہ خط ہلکے نیلے رنگ کے دیسی کاغذ پر مرقوم ہے خط کے ساتھ دو ورق اور لگے ہوئے ہیں، جن پر نواب عنایت جنگ بہادر کی تحریر ہے جس کے پڑھنے سے یہ روداد معلوم ہوتی ہے کہ یہ خط منشی حبیب اللہ ذکاؔ کے ایک عزیز نے نواب صاحب موصوف کو دیا تھا پھر اسے نواب صاحب معنون نے ڈاکٹر راحت اللہ خاں مرحوم کیوریٹر کتب خانۂ آصفیہ کو بتاریخ ۱۲ر اپریل ۱۹۵۵ء عنایت کیا کہ وہ اسے کتب خانہ میں داخل کر لیں۔ راحت اللہ خاں صاحب نے نہایت نفیس اور خوبصورت جلد بندھوا کر اس نادر خط کو محفوظ کر دیا۔

نواب عنایت جنگ نے ذکاؔ کے حالات بھی تحریر کئے ہیں، لیکن چونکہ ذکاؔ کے حالات غیر مشتہر نہیں اور تلامذۂ غالب وغیرہ میں تفصیل سے درج ہیں، نیز نواب صاحب کی تحریر سے ذکاؔ سے متعلق کوئی نئی اطلاع بھی نہیں ملتی اس لئے اس تحریر کو نقل کرنا میں نے چنداں ضروری نہ سمجھا۔

میں چاہتا تھا کہ غالب کے اس خط کو کسی رسالے میں شائع کرا دوں، لیکن میرے ایک صاحبِ ذوق دوست حبیب اللہ خاں بی اے (عثمانیہ) نے بتایا کہ مجتبیٰ مبارزالدین رفعت نے ماہنامہ "نگار" میں اسے شائع کرا دیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس خط کو شائع کرانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ابھی کچھ دن ہوئے محب مکرم جناب نثار احمد فاروقی کی عنایت سے جناب خلیق انجم کی مرتبہ کتاب "غالب کی نادر تحریریں" مجھے ملی جس میں زیر بحث خط بھی نقل ہوا ہے (ص ۹۵) اب جو میں نے اپنے ہاں کی نقل سے مقابلہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اس لئے کہ اس میں کافی عبارتیں چھوٹ گئی ہیں اور بعض لفظ زائد یا بدلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے خط مطالب کا ردّ ہو تا یقینی ہے۔ اس خط کے صفحہ پر حاشیہ میں خلیق انجم صاحب نے مبارزالدین رفعت کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ "مرزا حسین علی خاں (مرحوم) شعبۂ انگریزی جامعہ عثمانیہ کے پاس دیوان صائبؔ کا ایک قلمی نسخہ تھا جس میں سے غالب کا یہ خط برآمد ہوا"۔ ممکن ہے یہ واقعہ صحیح ہو، لیکن خط کے ساتھ نواب عنایت جنگ کی جو تحریر ہے غالباً اس میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں۔ اس حاشیے کی عبارت سے مجھے معلوم ہو سکا کہ مبارزالدین رفعت نے اپنے مضمون کے ساتھ اس خط کو "نگار" کے شمارہ اپریل ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا تھا۔ گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ "نگار" میں شائع ہونے کے چار سال قبل نواب عنایت جنگ نے اسے کتب خانے میں داخل کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رفعت صاحب نے خارجی ذرائع سے معلومات فراہم کی ہوں۔ یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ آیا مبارزالدین رفعت نے خط کے نقل کرنے میں غلطی کی ہے یا خلیق انجم صاحب ہی سے چوک ہو گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ خلیق انجم صاحب کی محض غلطیوں کو گنایا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند معروضات کے بعد پورا خط یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ غالب پرستوں تک یہ خط صحیح اور مکمل صورت میں پہنچے۔ خلیق انجم صاحب کی کتاب میں جو عبارتیں یا الفاظ چھوٹ گئے ہیں انھیں قوسین میں دیا جا رہا ہے اور جو الفاظ زائد یا غلط چھپے ہیں ان کی تصریحات حاشیے میں ہوں گی۔ اب صحیح خط ملاحظہ ہو:—

صبح شنبہ ۱۶ر جمادی الثانی سال ہفتم (۱۲۸۰ھ)

بندہ پرور، پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا، با کتب فیض سبیل نقل یہ آج مسودہ عرضداشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا، پیش گاہ آقائے نامدار گزرانا اور اپنے نام کے خط کا بھی جیش کرنا مناسب جانا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرضداشت کی تفتیش اور تلاش کی جائے جو دارالانشاء میں ملے تو جواب لکھا جاوے۔ یقین ہے کہ بعد گرد آوری کاغذات کے اگر عرضداشت مل گئی یا قصیدہ نکلے گا تو جواب ملے گا۔ ۱۲

اب میں بقول صائب سے

در ماندۂ کارِ خودم حیرانِ اطوارِ خودم
ہر لحظہ دارم گُم نیستی چو قرعۂ رمّال ہا!

یوں سمجھا ہوا تھا کہ دو نوں (رو) تھے جو عملی الغو اترکے بعد دیگرے ارسال ہوئے ہیں متواتر دارالانشاء میں پہنچے دھوں گے اور مہر منشی نے حضور میں گزرانے ہوں گے۔ اب ثابت ہوا کہ اگر دفتر میں پہنچے بھی تو مرجع کی نظر سے نہیں گزرے بلکہ بعید نہیں کہ منشی نے چاک کر کے پھینک دئے ہوں۔ ماکاروں ہی ہوا، بشرط التفات مولانا میرا مطلب اس صورت (میں) بھی فوت نہیں ہوتا یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ دو بار بعد نذر اُس میرزی معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عز اطلاع میں وہی لکھا جائے جو قصیدہ و عرضداشت کے گزرنے کے بعد لکھا جاتا۔ مولوی مولدالدین (خاں) صاحب جو حضرت کے مقرب اور اس حضرت میں ہوتے مقرب ہیں یہ کلمہ موجز کہہ سکتے ہیں۔ مگر میں

سلہ مل گئی ہو۔ سلہ نکل گیا۔ سلہ وارد۔ سلہ نوں۔ سلہ اور۔ سلہ اُس کی میری۔

اُن سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ یوں کہئے، خیر جو ہوا ہے ہو رہے گا، تم کو یہ اطلاع دے کر استطلاع کرتا ہوں کہ کیا وہ دونوں کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہوئے یا نہیں۔"

آگے اس سے جس دن دیوان کا پارسل اور ایک خط مولانا کو بھیجا ہے اُس کے دوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے، آج تک اُس پارسل کی رسید میں نے نہیں پائی، سخت مشوش ہوں اگر وہ پارسل پہنچ گیا ہو تو اس کی رسید لکھیئے۔

نجات کا طالب غالب ۱۲

ہاں، خوب یاد آیا وہ قصیدہ بھی اس کلیات میں مطبوع ہو گیا ہے، ۴۶۳ صفحہ، سطر ۱۲ دفتر سے قصیدے کا کاغذ (نہ) نکلنے کی صورت میں بھی (یہ) قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے۔

والسلام مع الاکرام

ایک اور اہم فروگزاشت خلیق انجم صاحب کی کتاب میں یہ ہو گئی ہے کہ غالب کے اس خط پر کوئی تاریخ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ غالب نے وقت، دن، تاریخ اور سن کی صراحت کے ساتھ خط شروع کیا ہے۔

حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کے اب تک جو اُردو خطوط دستیاب ہو کر شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد پندرہ ہے، خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر میں بھی یہی تعداد ہے۔ ابتدائی خطوط میں غالب نے مختار الملک نواب میر تراب علی خاں سرسالار جنگ اول وزیر اعظم ریاست حیدر آباد کی خدمت میں قصیدہ ارسال کرنے اور قدر افزائی نہ ہونے کی شکایت کی ہے۔ ایک خط میں مولوی موید الدین خاں کا نام بھی ملتا ہے جو نواب مختار الملک کے مقربین میں سے تھے۔ زیر بحث خط کو اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ اس خط کو اگر ان پندرہ خطوط میں شامل کر لیا جائے تو واقعات کی ترتیب متقاضی ہے کہ اسے پانچویں نمبر پر رکھا جائے اور چھٹے نمبر پر جو خط ۵ رجمادی الاول کا ہے تو لازمی طور پر (حوالہ) ۱۱ رجمادی الثانی کو لکھا ہوا خط اس کے بعد ہی آئے گا۔

لہ نوں ۔ لہ ہے تو۔

تبصرے

شہریار

جشنِ آزادی: مسعود اختر جمال

قیمت: ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: کتاب گھر چھوٹی بازار، جہان آباد، رائے بریلی۔

مسعود اختر جمال اُردو کے مقبول شعراء میں ہیں۔ جن لوگوں نے ان کا کلام مشاعروں میں سُنا ہے یا رسائل میں پڑھا ہے وہ ان کے شعری مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب مسعود اختر جمال کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں جشنِ آزادی، طرحِ نو، شمع کی لو تیز کر دو، ماتمِ آزادی، جانبِ منزل نو، تضاد اور آنسو کامیاب اور موثر ہیں۔ دوسری نظموں میں تکمیل اور وحدت کا وہ احساس نہیں ملتا جو نظم کی خوبی اور حسن ہے۔ جمال صاحب کی غزلوں پر اگرچہ جگر مرادآبادی کا اثر نمایاں ہے لیکن ایسے اشعار بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

اسی زمیں کو ہمیں آسماں بنانا ہے
ہمیں نہیں ہے کسی اور آسماں کی تلاش

داغِ جدائی کے صدموں سے کیا گزری ہے کس سے کہوں
کیسے کیسے پھول چمن کے نذرِ غمِ بیداد ہوئے

سفینہ ڈوبے کہ اُبھرے جمال کیا کہیے
ہوا بھی آج مخالف ہے ناخدا بھی نہیں

ہنر کی لاج رکھ لی ہم نے ورنہ • ہنر پامال تھا سود و زیاں سے

جنوں کی راہ میں یہ کون سا مقام آیا
کہ اب سراغِ زمان و مکاں نہیں ملتا

لغزشِ پا کا سہارا بھی نہیں رندوں کو
ساقیا بزم تری ہوش کی محفل تو نہیں

میری سات نظمیں: بلی پیام

قیمت: ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: شمع ادب لکھنؤ روڈ۔ سلطان پور۔

بلی پیام کی سات منتخب نظموں۔ کے اس مختصر مجموعہ کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور وہ خیال کے ارتقاء اور موضوع کی وسعت کو نظم کی تکمیل اور وحدت کے تابع رکھنا بھی جانتا ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ توجہ اور قابلِ تعریف ہے۔ "نہرو کی ایک تصویر دیکھ کر" "معذور کلپنا" اور "تم" کو بطورِ خاص پڑھنے کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔

بقیہ

اُردو کے چند کوزی تجھوتے

چند اور اصوات معیاری ہندی میں متبادل ہیں مثلاً ی اور ج۔ کلینگ اور کلنگ۔ یم ووت اور جم ووت۔ یمنا اور جمنا۔ ایودھیا اور اجودھیا۔ یدھ اور جدھ۔ یش اور جس۔ و اور ب۔ وچار اور بچار۔ بن واس اور بن باس۔ ورت اور برت۔ آکاش وانی اور آکاش بانی۔ وینا اور بینا۔ ویاپار اور بیوپار۔ ان صوتی جوڑوں کے باہمی تعلق کی تاریخ ڈ اور ڑ۔ اور ڈھ اور ڑھ سے کہیں زیادہ قدیم اور استوار ہے۔ اسی طرح س اور ش۔ ر اور ل بھی آپس میں بدلتے رہے ہیں لیکن اس بات سے آج ان کے تجھوتے یا ہم صوت ہونے پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ڈ اور ڑ کی صوتی مماثلت کا ذکر کیا گیا لیکن اسپھوٹ (منھ بند) اور جھٹپک دار ہوتا کوئی غیر معمولی مماثلت نہیں۔ اُردو کے مختلف تجھوتیوں کے جوڑوں میں اس قسم کی یا اس سے زیادہ مماثلت ہے لیکن وہ آزاد تجھوتے ہیں۔ ڈ کے اعتبار سے ڈ ٹ سے جس قدر مماثل ہے اس قدر ڑ سے نہیں لیکن ڈ اور ٹ ہم صوت نہیں۔ اسی طرح ڑ جھٹپک دار آواز ہے لیکن اس کا اسپھوٹ آواز ڈ سے کوئی تعلق نہیں۔

مرکب الفاظ پر غور کیا جائے۔ لفظ تین قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) مفرد۔ جس میں کوئی bound form (امدادی اجزا جو علیحدہ سے مکمل لفظ کے طور پر استعمال نہیں ہو سکتے) نہ ہو۔ جیسے سانڈ۔ ڈھونڈھ۔ (۲) شمولی (complex) جن میں ماوہ کے ساتھ ایک یا کئی امدادی اجزا شامل ہوں مثلاً لاڈلا۔ راہگیر۔ ڈھونڈھنا۔ (۳) مرکب (compound) جو دو یا دو سے زیادہ ایسے اجزا کا مجموعہ ہو جو بجائے خود مکمل الفاظ ہوں۔ مثلاً ڈاک گھر۔ Shot gun

ہاکٹ نے ان نزاکتوں میں نہ جا کر مرکب الفاظ کی محض دو قسمیں کیں۔ (۱) close-compound مثلاً ٹیلیگراف ٹیلیفون۔ فوٹوشاٹ۔ (۲) phrase-compound مثلاً بلیک بورڈ۔ موخرالذکر کو وہ لفظ اور فقرے کے درمیان جگہ دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ تجھوتے کے جائزے میں ان میں سے کون الفاظ لئے جا سکتے ہیں۔ مفرد الفاظ پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسری نوع یعنی شمولی الفاظ کے لئے ہمارے پاس ہاکٹ کی سند ہے کیونکہ اس نے loves. bayed وغیرہ کی آخری آواز سے اقلی جوڑے بنائے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ فاضل تبصرہ نگار امدادی اجزا والے الفاظ (شمولی) شامل کرنے کو تیار ہیں۔ بلاک اور ٹریگر نے فونیم /ج/ کے مختلف ہم صوتوں کی مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک ہم صوت صرف الفاظ کے درمیان میں ملتا ہے۔ اس کے لئے اس نے مرکب لفظ Shotgun مثال میں پیش کیا۔ اگر مرکب لفظ ہم صوت کے وقوع کی مثال کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے تو تجھوتے کے اسی وقوع کے لئے کیوں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ پھر بھی میں موجودہ جائزہ میں اس کے لئے مصر نہیں۔ ہاکٹ کی اصطلاح میں ہم phrase-compound سے دامن کش رہ کر محض close-compound تک محدود رہیں گے۔

سڈول۔ لاڈلا۔ نڈر۔ لاڈو اسی طرح شمولی لفظ ہیں جس طرح bayed. lays تبصرہ نگار کو ان الفاظ کے استعمال پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مسعود صاحب نے گڈریا کو مفرد لفظ سمجھا ہے حالانکہ اس کی نوعیت بھی شمولی ہے۔ سنسکرت میں بھیڑ کو گڈر یا گڈر (آخری حرف) اور گڈریکا بھی کہتے ہیں۔ گڈر اسی کا قائم مقام ہے 'یا' لاحقہ ہے والا کے معنی میں۔ یہ لاحقہ اُردو کے دوسرے الفاظ مثلاً دسونیا۔ نیاریا۔ باگڑیا۔ رام پوریا۔ جبلیا۔ فعلیا میں بھی ملتا ہے۔ مصوتین کے بیچ ڈ غالباً محض ایک مفرد لفظ 'اڈا' میں ملتا ہے۔ کھڑی بولی کے علاقے میں انھیں کوئی گڑریا یا اڑانا نہیں کہتا۔ کھڑی بولی کے جائزے میں دوسری بولیوں کے تلفظ کو شامل کرنا غلط مبحث بھی ہے اور ذہن کو پراگندہ کن بھی۔ سڈول۔ لاڈلا۔ نڈر۔ لاڈو اور کھنڈ ایسے الفاظ ہیں جو ڈ اور ڑ کے تکلی بٹوارے کی راہ میں مزاحم ہیں۔ یہ دوسرا ثبوت ہے کہ ڈ اور ڑ ہم صوت نہیں۔

ڈگڈگی۔ ڈیڈبانا۔ ڈگڈگانا (پانی پینے کا ایک انداز)

ان الفاظ کے آخری لاحقوں سے قطع نظر ان الفاظ کو اس طرح مرکب قرار نہیں دے سکتے جیسے بلیک بورڈ کو کیونکہ ان میں مادہ کی بازدہرائی ہے لیکن ان کا کوئی جزو بذات خود free form نہیں اس لئے ان کو بھی پیش نظر رکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

ڈھ کے سلسلے میں آپ ڈھرا بڈھری اور ڈھونڈھ کو نظرانداز کر دیجئے کیونکہ یہ استعمال میں نہیں آتے لیکن ڈھال اور کڈھب جو محض ایک امدادی جزو کے گنہگار ہیں ان سے آپ بے نیازی نہیں برت سکتے۔ راقم الحروف کے وطن ضلع بجنور میں ہندو اور مسلمان دونوں میں ایک نام 'کڈھیرا' ملتا ہے۔ اسم معرفہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہاں کی زبان ڈھ کو مصوتوں کے بیچ استعمال کرنے سے محترز نہیں۔ اسی علاقے میں بچے جب کوئی کھیل مثلاً کبڈی کھیلتے ہیں تو ہر پارٹی کا سرغنہ ڈھ کہلاتا ہے یعنی یہ لفظ محض کتابی نہیں چلن میں بھی ہے۔ ڈھ بھیڑ میں ڈھ سردار کے معنی میں نہیں اور بھیڑ جانور کے معنی میں نہیں۔ اس طرح اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس لفظ کا کوئی جزو تنہا استعمال نہیں ہوتا بشیر ممکن ہے مجھ سے کی خرابی ہو لیکن ڈھ محض امدادی جزو ہے

سلہ ضلع بجنور کے بارے میں یہ تحریر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مرتب H. R. Nevile کی رائے میں پڑھے لکھوں اور عوام میں اُردو کا استعمال یوپی کے کسی ضلع میں بجنور سے زیادہ نہیں پایا جاتا۔ بحوالہ ہندی مضمون کوروی اور راشٹر بھاشا ہندی از ڈاکٹر کرشن چند شرما مشمولہ راج رشی ابھی نندن گرنتھ ص ۷۰۲۔

اس لئے اس لفظ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ یہ چند الفاظ ڈھ اور ڑھ کو متضاد آوازیں ثابت کرنے کو کافی ہیں۔

ابھی حال میں مجھے آگرہ یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا وہاں میں نے لسانیات انسٹی ٹیوٹ کے مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر کیلکر سے استفسار کیا کہ تخصوتیوں کے جائزے میں مرکب الفاظ کو بھی زیر بحث لا سکتے ہیں کہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں، آپ کا جائزہ phonemic level ہے۔ مفرد و مرکب کی بحث grammatical level پر لے جائے گی۔ اس کا فونیم سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نہ صرف سڈول۔ لاڈلا۔ ڈگڈگی وغیرہ کو استعمال کر سکتے ہیں بلکہ بے ڈھنگا اور بے ڈھب کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔ کیلکر صاحب نے یہ بھی کہا کہ آپ سوڈا اور ریڈیو جیسے الفاظ بھی شامل کر سکتے ہیں۔ میں نے اعتراض کیا کہ یہ تو مستعار الفاظ ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اب ان کی حیثیت مستعار الفاظ کی نہیں یہ اسی طرح ہندی کے ذخیرے کے جزو ہو گئے ہیں جس طرح دوسرے الفاظ۔ اس کی جانچ یہ ہے کہ جو شخص انگریزی سے قطعی ناواقف ہے وہ بھی سوڈا اور ریڈیو کا لفظ بے تکلف استعمال کرتا ہے"۔ جواب معقول تھا۔ ہماری زبان کا مزاج مصوتوں کے درمیان ڈ کو گوارا کر سکتا ہے تبھی تو ان کا تلفظ بدستور رہنے دیا۔

فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ بولتے وقت لوگ ڈھونڈھ کا تلفظ ڈھونڈ ہی کرتے ہیں۔ میں گزارش کروں گا کہ ہاتھ کو ہات سیکھنا کو سیکنا۔ معاف کو ماف۔ جمعہ کو جما بولتے ہیں۔ آپ کسی زبان کے معیاری تلفظ کو ترجیح دیں گے یا عوامی مسخ شدہ تلفظ کو۔ اگر ہم مسخ شدہ غیر مستند تلفظ کی بات کرنے لگے تو کسی نقطے پر ٹھہر ہی نہیں سکتے۔ اسی نوٹ میں یہ لکھا ہے کہ ن ڈ سے پہلے کا مصوتہ ساانڈ کے علاوہ ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے۔ عرض ہے کہ ایک سانڈ ہی استثنا نہیں اس قسم کے الفاظ کا ایک ہجوم ہے بھانڈ۔ ڈانڈ۔ تانڈ۔ کانڈ۔ کھانڈ۔ مانڈ۔ رانڈ۔ سونڈ۔ کونڈ۔ گونڈ۔ اینڈ۔ بینڈ۔

میں نے ڈھونڈھنا کے بارے میں لکھا تھا کہ اس میں ڈھ درمیانی مصمتی خوشہ کا رکن اول ہے۔ نوٹ میں اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس لفظ میں درمیانی رکن ہی نہیں۔ یہ اعتراض میری فہم سے باہر ہے۔ چودھری محمد نعیم نے رکن کا لفظ syllable کے معنی میں نہیں استعمال کیا تھا بلکہ محض پہلے جزو۔ پہلے عنصر کے معنی میں۔ اگر فاضل تبصرہ نگار کا یہ خیال ہے کہ مصمتی خوشہ محض ایک ہی رکن کے اندر ہونا چاہئے تو میں ان سے اتفاق نہیں کر سکتا ڈھونڈھنا میں درمیانی (ڈھ ن) مصمتی خوشہ ہے جس کا پہلا جزو ڈھ ہے۔ چودھری محمد نعیم نے درمیانی مصمتی خوشے کے رکن اول ٹ اور ڈھ کی تائید میں گٹھلا۔ گٹھری اور بیٹھنا کی مثالیں درج کی تھیں۔ ڈھونڈھنا بھی اسی نوع کا ہے لیکن تبصرہ نگار کے لئے ہوئے لفظ ڈھنڈھورا میں ڈھ درمیانی مصمتی خوشہ میں جزو اول نہیں جزو ثانی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ چودھری محمد نعیم نے اپنے مضمون کے آخر میں ایک نوٹ دیا ہے کہ وہ اس کا مسودہ ڈاکٹر مسعود حسین کو دکھا چکے تھے اور ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید بھی ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا بحث کا لب لباب ان اصول میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) صوتی تجزیے کا بنیادی اصول تضاد و تکمیل کا ہے۔ اگر دو آوازوں کا محض ایک جوڑا ایسا مل جاتا ہے جو ان کے تکملی بٹوارے میں خلل انداز ہے تو وہ دو آوازیں قطعی طور پر آزاد تخصوتیے ہیں۔ بقیہ تمام الفاظ میں ان کے مختلف ماحول میں واقع ہونے کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۲) تخصوتیوں کے تعین میں کفایت کسی نئی تاویل کے ذریعہ کی جاتی ہے نہ کہ چند الفاظ سے چشم پوشی کر کے۔

(۳) اردو زبان کے تخصوتیوں کے لئے کھڑی بولی کا معیاری تلفظ ہی قابل غور ہو سکتا ہے۔ آس پاس کی دوسری بولیوں کا نہیں۔ کھڑی بولی کے الفاظ کا مسخ شدہ تلفظ ہمارے لئے کوئی وقعت رکھتا ہے۔

(۴) تخصوتیوں کے تعین میں مفرد الفاظ کے ساتھ دو شمولی (complex) الفاظ بھی جائزے میں شامل کئے جاتے ہیں جن میں مادہ کے ساتھ ایک یا کئی امدادی اجزاء ہیں یعنی جس کے تمام اجزا علیحدہ سے مکمل لفظ کے طور پر استعمال نہیں ہو سکتے۔

پبلشر [illegible] پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا